M.A.URDU/SEM-2, CC-V/ BY DR. TAUQEER ALAM

اردو غزل کا ارتقا

اردو غزل کا خمیر یوں تو شمالی ہندستان میں تیار ہوا لیکن ابتدا میں اس طرف خصوصی توجہ نہیں دی گئی۔ وجہ یہ تھی کہ فارسی، معیاری اور سرکاری زبان تھی اور اردو اپنے تشکیلی دور سے گزر رہی تھی اور اس عہد کے ادبا و شعرا نے اسے قابل اعتنا نہ جانا۔ اس نومولود زبان کو شعر و ادب کے شایان شان نہیں سمجھا گیا لیکن دکن میں اس نئی زبان کو شعرا نے قابل توجہ جانا۔ اس عہد میں دکن میں بھی مسلمانوں کی سلطنتیں قائم ہو چکی تھیں۔ قطب شاہی اور عادل شاہی خاندانوں نے اس کی سرپرستی کی۔ اس طرح اردو کو فروغ پانے کا موقع ملا۔ قلی قطب جو خود بادشاہ تھا، اس نے اردو کو شاعری کی زبان بنایا۔ یہاں تک کہ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہونے کا فخر اسے حاصل ہوا۔ شاہ کی اس اردو دوستی کو دیکھتے ہوئے اس عہد کے شعرا و ادبا کا اس جانب متوجہ ہونا فطری امر ہے۔ یہی وجہ رہی ہوگی کہ شعرا نے اردو کو سر آنکھوں پر بٹھانا قابل فخر جانا ہوگا۔ ابتدائی دور میں دکن کے مشہور شعرا میں قلی قطب شاہ کے علاوہ وجہی، غواصی، اور ہاشمی وغیرہ کا نام لیا جاتا ہے ان شعرا نے خصوصیت کے ساتھ اردو میں غزلیں کہیں۔ اس عہد کی غزلوں میں حسن و عشق کا ذکر عام ہے۔ لیکن یہ غزلیں تاریخی اہمیت کی حامل ہے اور ان سے اردو زبان کی ابتدائی شکل اور نوعیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ چند اشعار دیکھیں ؎

منج عشق کری آگ کا یک جنکی ہے سورج
اس آگ کے شعلے کا دھواں سات گگن ہے
پیا باج پیالا پیا جائے نا
پیا باج اک تل جیا جائے نا
قطبؔ شاہ

طاقت نہیں دوری کی اب توں بیگی آمل رے پیا
تج بن منج جینا بہوت ہوتا ہے مشکل رے پیا
وجہیؔ

ملا وجہیؔ کے مذکورہ اشعار ریختی کی یاد دلاتے ہیں۔ اسی طرح ہاشمی کی غزلوں میں ریختی کا انداز ہے۔ ہاشمی کی ایک غزل جس میں عورت کے عشقیہ جذبات کا تسلسل سے بیان ہوا ہے، ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ لکھنؤ والوں نے اسی کی تقلید میں ریختی کو جنم دیا لیکن عشقیہ واردات کا یہ اظہار ریختی کی بنیاد نظر آتا ہے۔ ہاشمی کی اس غزل کے چند اشعار دیکھیں ؎

سجن آویں تو پردے کے نکل کر بھار بیٹھوں گی
بہانا کرکے موتیاں کا پروتی ہار بیٹھوں گی
ہاشمیؔ

بعد میں مغل حکمراں کی دکن میں فتح کے ساتھ یہاں کے تہذیبی رنگ پر ان کی چھاپ پڑی۔ فارسیت کا رنگ غالب ہونے لگا۔ یہ سترہویں صدی کے اختتام اور اٹھارہویں صدی عیسوی کے آغاز کا زمانہ ہے۔ ولیؔ دکنی اسی عہد میں اپنی غزل گوئی کے ایک خاص رنگ کے ساتھ دہلی میں داخل ہوتا ہے۔ اور اپنی غزلوں سے شمالی ہند والوں کو چونکا دیتا ہے۔ یہاں اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ اسی عہد میں اردو غزل گوئی میں تصوف شامل ہوا۔ چونکہ مغلوں کے حملے اور شکست کے بعد دکن کے لوگوں میں اضطراب اور مایوسی پیدا ہو چلی تھی۔ ایسے میں تصوف میں انہیں پناہ ملی۔ عبادت بریلوی اس صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''مغلوں کے حکمراں ہو جانے کے بعد دکن کے افق پر اداسی اور سوگواری کے بادل منڈلانے لگے۔ ہر فرد ایسی الجھنوں اور پریشانیوں کا شکار ہوا کہ اسے زندگی میں تاریکی ہی تاریکی نظر آنے لگی۔ اس صورتحال نے ایک طرف تو سوز و گداز کو پیدا کیا اور دوسری طرف زندگی کے شعور کو بڑھایا۔ اس کو سمجھنے کی طرف توجہ دلائی۔ اس وقت تک دکن میں زندگی کو جو ایک رنگین عینک سے دیکھا جاتا تھا وہ صورت اب ختم ہوگئی۔ اب بنیادی حقائق کو سمجھنے اور ان پر غور کرنے کا رجحان عام ہوا۔ تصوف ان حالات میں ایک بڑا سہارا ہوتا ہے۔ چنانچہ اس زمانے میں تصوف اور اس کے مسائل کی طرف بھی خاص طور پر توجہ کی گئی۔'' (غزل اور مطالعہ غزل۔ عبادت بریلوی)

ولیؔ اسی عہد کا پروردہ شاعر ہے۔ اس کے یہاں عشقیہ اور دیگر مضامین کے علاوہ تصوف کے مسائل بھی پائے جاتے ہیں۔ اور بقول عبادت بریلوی ''اردو غزل ولیؔ کے ہاتھوں غزل کی صحیح روایات سے آشنا ہوئی'' چند اشعار دیکھیں ؎

گل ہوئے غرق آب شبنم میں　　دیکھ اس صاحب حیا کی ادا
مسند گل منزلِ شبنم ہوئی　　دیکھ رتبہ دیدۂ بیدار کا

ولی کی طرح سراج اورنگ آبادی بھی صوفی تھے۔اورانہوں نے ولی کے رنگ کو اپنی غزلوں میں شامل کیا۔انہوں نے بقول عبادت بریلوی ''تصوف کے مسائل کو عشقیہ لب ولہجہ بخشا ہے۔'' سراج اورنگ آبادی میں غزلوں میں صفائی اور شستگی ہے۔گویا اردو نے تشکیل کا ایک اور مرحلہ طے کرلیا ہے۔چند اشعار ملاحظہ فرمائیں ؎

خبر تحیر عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ تو تو رہا نہ تو میں رہا جو رہی سو بے خبری رہی
چلی سمت غیب سے کیا ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا
مگر ایک شاخ نہال غم جسے دل کہیں سو ہری رہی

شمالی ہندستان کی بات کریں تو غزل کا پہلا نقش امیر خسرو کے یہاں ملتا ہے۔ان کی مشہور غزل جس میں بیک وقت فارسی اور ہندوی زبان کا استعمال کیا گیا ہے، اس ضمن میں پیش کیا جاتا رہا ہے۔ایک شعر ملاحظہ ہو۔

زحال مسکیں مکن تغافل درآئے نینا بنائے بتیاں
کہ تاب ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں

دہلی میں ایک ایسا دور بھی آیا کہ غزل ایہام گوئی سے دو چار ہوئی۔دراصل اس عہد کے سیاسی اور سماجی حالات کے ساتھ ساتھ فارسی کی تقلید نے بھی ایہام گوئی کو ہوا دی۔ایہام گوئی کو ادبی حیثیت دینے میں حاتم، آبرو، شاکر ناجی، مصطفی خاں یکرنگ اور مضمون واحسن اللہ وغیرہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔لیکن ایہام گوئی کا زور زیادہ دنوں کا قائم نہ رہ سکا۔ظاہری بات ہے اپنی اقدار سے کٹ کر بے سمت سفر کے راستے پر بہت دور تک نہیں جایا جاسکتا۔لہٰذا ایہام گوئی کا یہ زور ٹوٹ گیا۔اس رجحان کو اینٹی غزل کی طرح اینٹی رجحان کہا جانا چاہئے۔چونکہ اینٹی غزل میں بے تکی قافیہ آرائی کی گئی تو ایہام گوئی بھی شاعری کے نام پر ایک کھیل ہی تھی جس میں شاعری کم ایک طرح کا پھکڑ اور لاابالی پن زیادہ تھا۔مگر اس عہد میں بھی کچھ شعرا اپنی شاعرانہ خصوصیات کی بنا پر مشہور ہوئے۔ان میں آبرو اہم ہیں حالانکہ ایہام گوئی کو تحریک کی صورت دینے والوں کے ساتھ آبرو کا نام بھی پیش پیش لیا جاتا ہے۔فرق یہ ہے کہ آبرو نے کچھ ایسی شاعری بھی کی جو ایہام گوئی سے الگ اور حسن وعشق کے عام رجحان کی ترجمان تھی۔یہی وجہ ہے کہ میر تقی میر نے اپنی ''نکات الشعرا'' میں آبرو کو'' شاعر نادرہ گوئے ریختہ'' اور میر حسن نے ''تذکرہ شعرائے اردو'' میں ''شاعر خوش گوئے'' کہا ہے۔چند اشعار دیکھیں ؎

نین سے نین جب ملائے گا
دل کے اندر مرے سمائے گا
کرتے تو ہو تغافل پر حال آبرو کا
دیکھو تو تم بھی پیارے بے اختیار رو دو

ایہام گوئی کو رواج دینے والے دوسرے اہم شاعر حاتم ہیں لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ اس کی بیخ کنی بھی حاتم نے ہی کی۔حاتم کو یہ احساس ہوگیا کہ ایہام گوئی کے نام پر جو کچھ کیا جارہا ہے وہ شاعری نہیں ہے۔شاعری جس سنجیدگی، متانت اور دور بینی کی حامل ہوتی ہے ایہام گوئی سے اس کا رشتہ نہیں ہوسکتا۔اسی بنا پر انہوں نے ایہام گوئی کو خیر باد کہہ کر غزل کو غزل کی طرح کہنا شروع کیا۔حاتم ایہام گوئی سے اس قدر تائب ہوئے کہ اپنا دیوان ترتیب دیتے وقت اس بات کا التزام کیا کہ ایہام گوئی والے اشعار اس میں شامل نہ ہوں۔حاتم کے چند اشعار دیکھیں ؎

اے خرد مندو مبارک ہو تجھے فرزانگی
ہم ہوں اور صحرا ہو اور وحشت ہو اور دیوانگی
پیری میں حاتم اب نہ جوانی کو یاد کر
سوکھے درخت بھی کہیں ہوتے ہیں پھر ہرے

اس عہد کے ایک اہم شاعر مضمونؔ ہیں۔جن کا درج ذیل شعر آج بھی عام ہے۔

ہم نے کیا کیا نہ ترے غم میں اے محبوب کیا
صبر ایوب کیا گریۂ یعقوب کیا

شاکر ناجیؔ اور یک رنگؔ کے بھی دو دو اشعار ملاحظہ فرمائیں

اس کے رخسار دیکھ جیتا ہوں

عارضی میری زندگانی ہے
تصور سے ترے رخ کے گئی ہے نیند آنکھوں سے
مقابل جس کے ہو خورشید کیوں کر اس کو خواب آوے

شاکرناجی

چاہتا تھا کہ کرے عشق کی باتیں یک رنگ
کیا کرے ہائے اسے طاقت گفتار نہیں
نہ کہو یہ کہ یار جاتا ہے
جی سے صبر و قرار جاتا ہے

یک رنگ

اس کے بعد اردو غزل ایک نئے عہد سے روشناس ہوئی۔ یہ دور میرؔ، سوداؔ، دردؔ اور مظہر جان جاںؔ سے عبارت ہے۔ اسی عہد میں اردو غزل گل و بلبل اور عشق و عاشقی کے مضامین و موضوعات سے نکل کر زندگی کی ہمہ رنگی سے دوچار ہوئی۔ اپنے ماحول کی طرف دیکھنا بھی اسی عہد میں سیکھا۔ چونکہ سیاسی طور پر یہ نہایت ہی ابتری اور افراتفری کا دور تھا۔ دہلی بار بار کے حملوں سے تاراج ہو رہی تھی۔ اورنگ زیب کے انتقال کے ساتھ ہی مغلیہ سلطنت انحطاط پذیر تھی۔ نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں نے زندگی کا سکون غارت کر دیا تھا اور آدمی وحشت کا شکار تھا۔ ان حالات نے مایوسی کو جنم دیا۔ انسان کے اندر بے اعتباری کا احساس پیدا ہو گیا۔ اسی کے ساتھ شعرا کے کلام میں سوز گداز پیدا ہوا حالانکہ یہ عہد سودا کا بھی تھا۔ سوداؔ کو اگرچہ ''واہ وا'' کا شاعر کہا جاتا ہے لیکن یہ بات ان کے ہجویہ کلام سے عبارت ہے۔ غزلوں میں ان کے یہاں بھی سوز و گداز اور داخلی اضطراب ہے۔ میرؔ کی شاعری اگرچہ مجموعی طور پر عشقیہ جذبات سے عبارت ہے اور اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ محبت میں انہوں نے ہجر اور جدائی کا غم پایا تھا۔ انہی اندرونی کیفیات کی ترجمانی انہوں نے اپنی شاعری میں کی ہے۔ اس کے باوجود زمانے کے نشیب و فراز کا عکس بھی ان کے یہاں نظر آتا ہے۔ یعنی میرؔ کے یہاں خارجی اور داخلی دونوں عوامل، حزن و یاس سے مملو ہیں۔ ایک طرف ماحول کی ابتری تو دوسری طرف مالی تنگی اور عشق میں ناکامی نے انہیں مرقعِ یاس بنا دیا۔ اس کی بدولت ان کی شاعری میں گداختگی، وارفتگی، سوز نہاں و احساس زیاں اور ٹوٹنے و بکھرنے کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ یہ میرؔ کا کمال ہے کہ غم ذات کو غم جہات بنا دیا ہے۔

آوارگان عشق کا پوچھا جو میں نشاں
مشت غبار لے کے صبا نے اڑا دیا
اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

سوداؔ کے یہاں زندگی کے تنوع کے ساتھ عشقیہ جذبات بھی پائے جاتے ہیں اور دردمندی بھی ہے

کیفیت چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا
ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں
فکرِ معاش عشقِ بتاں یادِ رفتگاں
اس زندگی میں اب کوئی کیا کیا کرے

تصوف کے حوالے سے اردو شاعری میں جن تین شعرا کا نام خصوصیت سے لیا جاتا ہے ان میں ایک میر درد ہیں۔ درد صوفی منش تھے۔ ان کے یہاں تصوف کے مسائل پائے جاتے ہیں۔ عشق حقیقی کے مدارج و مراحل بھی انہوں نے طے کئے۔ عشق مجازی بھی ان کے یہاں پایا جاتا ہے مگر تصوف سے وابستگی ہونے کے سبب ان کے عشقیہ کلام میں صفائی اور ستھرائی پائی جاتی ہے۔

ہمارے پاس ہے کیا جو فدا کریں تجھ پر
مگر یہ زندگی مستعار رکھتے ہیں
تردامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

اس عہد کے شعرا میں سوز، مظہر جان جاں اور فغاں بھی اہم ہیں۔ ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو

یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے
مظہر جان جاں

آج اس راہ دل ربا گزرا
جی پہ کیا جانیے کہ کیا گزرا
میر سوز

ہوکر ترے قفس سے میں آزاد کیا کروں
بے بال و پر ہوں اے مرے صیاد کیا کروں
اس کے وصال و ہجر میں یونہی گزر گئی
دیکھا تو ہنس دیا جو نہ دیکھا تو رو دیا
فغاں

مجھے آتا ہے رونا ایسی تنہائی پہ اے تاباں
نہ یار اپنا نہ دل اپنا نہ تن اپنا نہ جاں اپنا
تاباں

دوسری طرف تقریباً اسی عہد سے وابستہ لکھنؤ میں انشا، مصحفی، میر حسن، جرأت اور رنگین غزل کو ایک نیا رنگ دے رہے تھے۔ مصحفی کے بارے میں تو خیر کہا جاتا ہے کہ وہ میر اسکول کے ''شاگرد'' تھے لیکن انشا رنگیں اور جرأت، غزل کی ایک نئی طرح ڈال رہے تھے۔ لکھنؤ میں چونکہ فارغ البالی تھی۔ نوابین کی عیش و عشرت سے ان کی آنکھیں بھی خیرہ ہوگئیں اور وہ دریائے نشاط میں غوطے لگانے لگے یہاں تک کہ ان کے قلم کو بھی انضباط کا یارانہ رہا۔ ایسے میں شاعری تجاوز کرتے کرتے اخلاقی سرحدوں کو پار گئی بلکہ پھکڑ پن کی حد میں داخل ہوگئی۔ ان کھل کھیلنے والوں میں انشا، جرأت اور رنگیں وغیرہ امام کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کی نمائندگی آتش نے کی۔ البتہ میر حسنؔ نے ان اثرات کو قبول نہ کیا اور غزل کے رنگ کو برقرار رکھا۔

دیکھا جو واں نہ تجھ کو گماں سو طرف گیا
آئے نہ ہوتے کاش کہ ہم کوئے یار تک
نوگرفتاری کے باعث مضطرب صیاد ہوں
لگتے لگتے جی قفس میں بھی میرا لگ جائے گا
میر حسنؔ

اسی عہد سے تعلق ہونے اور انشاء جیسے شاعر کے ہم عصر ہونے کے باوجود مصحفیؔ نے غزل کی آبرو کو برقرار رکھا۔ مصحفی کے یہاں شاعری کا وہی قدیم رنگ یا حسن و عشق کی باتیں تو ہیں مگر مصحفی نے ابتذال اور رکاکت سے دامن کو بچائے رکھا ؎

دل میں کہتے تھے ملے یار تو کچھ اس سے کہیں
مل گیا وہ تو نہ اک حرف زباں سے نکلا
باہم جنہوں میں مہر و مروت کی راہ تھی
وہ لوگ کیا ہوئے وہ زمانہ کہاں گیا
مصحفیؔ

انشاء اور جرأت کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں جو معاملات عشق اور جنسیت پر مبنی ہیں ؎

جگاؤں میں جو سوتے سے تو کیا برہم ہو کہتا ہے
خدا جانے اٹھے ہیں آج ہم منھ دیکھ کر کس کے
جب تلک ہم نہ چاہتے تھے تجھے
تب تک ایسا ترا جمال نہ تھا
جرأتؔ

یہ جو مہنت بیٹھے ہیں رادھا کے کنڈ پر

اوتار بن کے گرتے ہیں پریوں کے جھنڈ پر
واں جھوٹ موٹ تم نے بناوٹ سے غش کیا
ہم سچ مچ ایسے روئے کہ یاں چٹ سے غش کیا

انشااللہ خاں انشا

انشا کی ایک غزل بہت مشہور ہوئی اور آج بھی اس کے کچھ اشعار زبان زدعام ہیں۔انشا اگر سنجیدہ شاعری کا قائل ہوتا، اردو کے نامور شاعروں میں شمار ہوتا۔اس کی مشہور غزل کے دو شعر دیکھیں ؎

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں
نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بے زار بیٹھے ہیں

عوامی شاعر کہا جانے والا نظیر کا تعلق بھی اسی عہد سے ہے۔اگر چہ نظیر کو عام بول چال کی نظموں کی وجہ سے جانا جاتا ہے لیکن انہوں نے صنف غزل میں بھی طبع آزمائی کی ۔ایک دو شعر دیکھیں

نہ گل اپنا، نہ خار اپنا، نہ ظالم باغباں اپنا
بسایا آہ کس گلشن میں ہم نے آشیاں اپنا
مے بھی ہے مینا بھی ہے ساغر بھی ہے ساقی نہیں
دل میں آتا ہے لگادیں آگ میخانے کو ہم

کم وبیش یہی عہد ناسخ اور آتش کا بھی رہا ہے۔ان شعرا کے یہاں بھی لکھنؤ طرز شاعری کے اثرات پائے جاتے ہیں لیکن انہوں نے اصلاح زبان پر بھی زور دیا خصوصاً اصلاح زبان کیلئے ناسخ نے شہرت پائی۔آتش نے شاعری کو لفظوں کی نگینہ کاری تصور کیا اور اپنے فن کی بدولت اردو کا ایک بڑا غزل گو شاعر تسلیم کئے گئے۔ چند اشعار دیکھیں ؎

آئے بھی لوگ بیٹھے بھی اٹھ بھی کھڑے ہوئے
میں جا ہی ڈھونڈتا تری محفل میں رہ گیا
زمین چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا
دکھاتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

عبادت بریلوی نے ناسخ کو ’شاعر کم اور استاد زیادہ‘ مانا ہے۔ان کے یہاں رعایت لفظی اور صنعت گری میں شاعری دب کر رہ گئی ہے۔بہر حال دو اشعار دیکھیں ؎

اے بتو ہوتی جو تھوڑی سی محبت تم میں
کوئی کافر بھی نہ واللہ مسلماں ہوتا
ترا کوچہ جو ہے فردوس تو نہریں بھی لازم ہیں
ضرورت سے ہے یاں ہونا ہماری چشم گریاں کا

ان سخنوروں کے بعد اردو شاعری کا عہد زریں شروع ہوتا ہے۔اس دور کے شعرا میں شاہ نصیر، ذوق، غالب، مومن اور شیفتہ وغیرہ اہم ہیں۔یہ تمام شعرا اپنی جگہ آفتاب ہیں جنہوں نے غزل گوئی میں اپنی راہ نکالی۔خصوصاً غالب نے جنہیں تنگنائے غزل کا شکوہ تھا، غزل کو نئی وسعت اور معنویت سے ہم کنار کیا اور مضامینِ گل وبلبل سے نکال کر زندگی پر محیط کر دیا۔غالب آج اپنی غزلوں کے حوالے سے اردو کے سب سے بڑے شاعر تسلیم کئے جاتے ہیں اور بجا طور پر وہ اس کے مستحق ہیں۔اسی طرح ذوق اگر چہ غالب کے ہم پلہ نہیں مگر ان کی شاعری بھی ایک زمانہ کو متاثر کرتی ہے۔مومن غزلوں میں اپنی طرفگی کی وجہ سے جانے جاتے ہیں۔ان شعرا کے چند اشعار دیکھیں ؎

وجہ معلوم تو ہو چیں بہ جبیں ہونے کی
سچ کہو جی میں ہے کیا کس سے لڑا چاہتے ہو
اس قدر ہم نے کیا ہے تم کو یاد
ایک عالم کو ہماری یاد ہے

شاہ نصیرؔ

بجا کہے جسے عالم اسے بجا سمجھو
زبان خلق کو نقارۂ خدا سمجھو

اے شمع تیری عمر طبیعی ہے ایک رات
ہنس کر گذار یا اسے رو کر گذار دے

ذوقؔ

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

زاہد نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمہاری شراب طہور کی

اگ رہے ہیں در و دیوار پہ سبزہ غالب
تم بیاباں میں ہو اور گھر میں بہار آئی ہے

غالبؔ

اس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

مومنؔ

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ
اک آگ سی ہے سینہ کے اندر لگی ہوئی

شیفتہؔ

بہادر شاہ ظفر کا تعلق بھی اسی عہد سے تھا۔ دو شعر دیکھتے چلیں ؎

ہے کتنا بد نصیب ظفر دفن کیلئے
دو گز زمیں بھی مل نہ سکی کوئے یار میں

پس مرگ میرے مزار پر جو دیا کسی نے جلا دیا
اسے آہ دامن یاد نے سرشام ہی سے بجھا دیا

بہادر شاہ ظفرؔ

اس کے بعد امیر، داغ اور جلال کا دور آتا ہے۔ سیاسی طور پر ہندستان کیلئے یہ عہد افراط وتفریط کا تھا۔ ۱۸۵۷ کی جنگ کے بعد بہادر شاہ ظفر قید کر لئے گئے اس طرح دہلی کی ادبی محفلیں برخاست ہوگئیں۔ دہلی میں حکمراں کی سرپرستی سے محروم ہوکر شعرا نے لکھنؤ کا رخ کیا۔ لکھنؤ میں اس وقت زندگی خوشحال تھے۔ ان مہاجر شعرا کا لکھنؤ میں استقبال کیا گیا۔ لیکن وقت بڑی تیزی سے بدل رہا تھا۔ وہ دن جلد آ گیا جب اودھ کے نواب واجد علی شاہ اختر کو بھی معزول کر دیا تھا۔ لکھنؤ پر اس قیامت کے ٹوٹنے سے شعرا ایک بار پھر بے یار ومددگار ہوگئے۔ چونکہ شعرا، حکمرانوں اور نوابوں کی سرپرستی تھے، جب وہی اجڑ گئے تو شعرا بھی دربدر ہوگئے۔ دو بڑے ادبی دبستانوں کے ''زیر وزبر'' ہونے کے بعد شعرا نے جائے پناہ کے لئے مختلف سمتوں کا رخ کیا۔ کچھ حیدرآباد چلے گئے کچھ ٹونک اور بھوپال گئے اور کچھ نے رام پور میں سکونت اختیار کی۔ تاریخ سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ لکھنو کے برباد ہونے کے بعد بیشتر شعرا رام پور میں آ کر آباد ہوگئے۔ چونکہ رام میں اس وقت یوسف علی خان ناظم تاجدار رامپور جیسا صاحب علم وادب موجود تھا، جس سے شعرا کو سرپرستی کی امید تھی۔ رام پور میں سکونت اختیار کرنے والوں میں تین بڑے اہم شاعر تھے۔ امیرؔ مینائی، داغؔ دہلوی اور ضامن علی جلالؔ۔ یہ اپنے دور کے اردو غزل کے مثلث تھے۔ آج بھی ان کا نام غزل کے حوالے سے احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ ان شعرا نے اردو غزل کو نیا اسلوب اور نیا انداز دیا۔ ان کے یہاں داخلی اور خارجی دونوں کیفیات پائی جاتی ہیں۔ سیاسی انحطاط اور افراط وتفریط کے باوجود ان کے یہاں رنگین بیانی پائی جاتی ہے لیکن زندگی کا شعور اور سماجی ذمہ داری کا حساس بھی ہے اور دنیا کی بے ثباتی کا ذکر بھی ہے۔ خصوصاً امیرؔ مینائی، داغؔ کے مقابلے میں زندگی کے مختلف مسائل وموضوعات کا احاطہ کرتے نظر آتے ہیں ؎

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

کیا باغ میں دیکھتی ہے شبنم
جو گل کی ہنسی پہ رو رہی ہے

قریب ہے یارو روز محشر چھپے گا کشتوں کا خون کیوں کر
جو چپ رہے گی زبان خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

امیرؔ مینائی

وہ ناز سے زمین پر رکھتے نہ تھے قدم
تعریف کرکے اور بھی ہم نے اڑا دیا

گالیاں غیر کو دیتا ہوں سنو تم خاموش
میں بھی دیکھوں تو بڑے بات نہ کرنے والے

داغؔ

جلالؔ باغِ جہاں میں وہ عندلیب ہیں ہم
چمن کو پھول ملے ہم کو داغ بھی نہ ملا

آنسو رکے تو کیا نہیں چھپنے کا راز عشق
حسرت ٹپک پڑے گی ہماری نگاہ سے

جلالؔ

اسی عہد سے وابستہ ایک شاعر محسن کاکوروی بھی ہیں۔ محسن، امیرؔ کے شاگرد تھے۔ لیکن ان کا تعلق نعت سے ہے۔ محسن نے صرف نعتیں لکھی ہیں۔ اس لئے غزل کے حوالے سے ان کا ذکر نہیں ہوسکتا۔ ان شعرا کے بعد حالی، اکبر الہ آبادی، چکبست، اقبال، حسرت موہانی، اصغر گونڈوی، ریاض خیر آبادی، اور شاد عظیم آبادی جیسے شعرا کی صف ہے۔ ان تمام شعرا کی اپنی اپنی خصوصیات ہیں اور سبھوں نے اپنی الگ پہچان بنائی ہے۔ اس عہد میں جب شعرا کی توجہ نظم کی طرف مبذول ہونے کے سبب غزل صرف نظری کی شکار ہورہی تھی، حسرت موہانی نے اسے سنبھالیا اور اقبال نے نئی معنویت اور نئی جہات سے آشنا کیا۔ وہیں ریاض خیر آبادی نے تصوف کی رنگ آمیزی سے غزل کو متصف کیا جبکہ شاد عظیم آبادی نے دہلی کی داخلیت کو اپنا شعار بنا کر غزل کو ایک نیا رنگ وروپ دیا۔ شاد کا شمار اردو کے بڑے شاعروں میں ہوتا ہے۔ یہ انیسویں صدی کا آخر اور بیسویں صدی کا ابتدائی زمانہ تھا۔ جنگ آزادی کی لڑائیاں شباب پر تھیں۔ کچھ شعرا نے حب الوطنی پر نظمیں کہنے میں خصوصیت پیدا کی۔ ان میں چکبست کا نام سرفہرست ہے۔ اکبر الہ آبادی نے اگرچہ کچھ غزلیں بھی کہیں لیکن بنیادی طور پر وہ غزل کے آدمی نہ تھے۔ ان شعرا کے چندے اشعار ملاحظہ فرمائیں ؎

یوں بے سبب زمانہ پھرتا نہیں کسی سے
اے آسماں کچھ اس میں تیرا بھی ہے اشارا

یارب نگاہ بد سے چمن کو بچائیو
بلبل بہت ہے دیکھ کے پھولوں کو باغ باغ

حالیؔ

اللہ رے جسم یار کی خوبی کہ خود بخود
رنگینیوں میں ڈوب گیا پیرہن تمام

حسن بے پروا کو خودبین و خود آرا کردیا
کیا کیا میں نے کہ اظہار تمنا کردیا

جنوں کا نام خرد رکھ دیا خرد کا جنوں
جو چاہئے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

حسرت موہانی

یہی تھوڑی سی مے ہے اور یہی چھوٹا سا پیمانہ

اسی سے رند راز گنبد مینا سمجھتے ہیں
رخ رنگیں پر موجیں ہیں تبسم ہائے پنہاں کی
شعاعیں کیا پڑیں رنگت نکھر آئی گلستاں کی
اصغر گونڈوی

فروغ مے ہے یا عرش بریں سے نور آتا ہے
کہ ساغر تاک سے بن کر چراغ طور آتا ہے
پی پی کے اس نے سجدے کئے ہیں تمام رات
اللہ رے شغل زاہد شب زندہ دار کا
ریاض خیرآبادی

یہ بزم مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھالے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے
ان کی نگاہ ناز جو پلٹی تو دیکھنا
منھ دیکھتی رہے گی حقیقت مجاز کا
تمناؤں میں الجھایا گیا ہوں
کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں
شاد عظیم آبادی

اقبال کی غزل گوئی سے متعلق گفتگو پچھلے صفحات میں ہو چکی ہے اسلئے یہاں مزید کلام کرنا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ البتہ اختصار سے کام لیتے ہوئے یہاں چند شعرا کے نام گنانے پر اکتفا کرنا ہوگا۔ لکھنو میں اس دور میں کچھ ایسے شعرا بھی ہوئے جنہوں نے غزل کی آبیاری کی۔ شادؔ اور ریاضؔ کا یہ دور غزل کا جدید دور کہلاتا ہے۔ اس دور میں ان کے علاوہ عزیز لکھنوی، صفی لکھنوی، فانی بدایونی، جلیل مانک پوری، آرزو لکھنوی، یگانہ چنگیزی وغیرہ کا نام خصوصیت کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ ان شعرا نے غزل کے روایتی انداز کو برقرار رکھا۔ ان شعرا کا صرف ایک ایک شعر ملاحظہ فرمائیں ؎

یہ زندگی کی ہے روداد مختصر فانی
وجود دردِ مسلسل علاج نامعلوم
میری ہوس کو عیش دوعالم بھی تھا قبول
تیرا کرم کہ تونے دیا دل دکھا ہوا
فانی

اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز تھا حسن
بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا
عزیز لکھنوی

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا
ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا
صفی لکھنوی

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے
جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے
ثاقب لکھنوی

ان کے بعد سیماب اکبرآبادی، جوش ملیح آبادی، علامہ جمیل مظہری، اثر لکھنوی، احسان دانش، جگر مرادآبادی، ثاقب لکھنوی، وحشت، فیض احمد فیض، قتیل شفائی اور فراق گورکھپوری کے نام اہم ہیں۔ غزل نے اس عہد میں ایک نئی کروٹ لی۔ اسلئے اس دور کو غزل کا جدید دور کہا جاتا ہے۔ اسی عہد میں شعرا کے یہاں سماجی شعور پیدا ہوا۔ ان لوگوں نے ترقی پسندی کے عہد کو دیکھا تھا لیکن یہ وہ شعرا ہیں جو نعرہ بازی سے دور رہے۔ فیض کا تعلق بھی ترقی پسندی سے تھا لیکن انہوں نے بین بین کا راستہ

نکالا۔ بہرحال اس عہد کے چند شعرا کا نمونہ کلام دیکھیں:

اب تک نہ خبر تھی مجھے اجڑے ہوئے گھر کی
تم آئے تو گھر بے سروساماں نظر آیا
جوشؔ

یاد ماضی عذاب ہے یارب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا
اختر انصاری

عشق سے ہوئے تائب اے قتیل ہم پھر بھی
اپنا ذکر چھڑتا ہے اب بھی نازنینوں میں
قتیل شفائی

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے
فیضؔ

ہزار بار زمانہ ادھر سے گزرا ہے
نئی نئی سی ہے کچھ تیری رہ گذر پھر بھی
فراقؔ

ہمارے گھر کے منڈیروں پہ ناصر
اداسی بال کھولے سو رہی ہے
ناصر کاظمی

ان کے علاوہ مجاز، جذبی، مجروح، ابن انشا، وغیرہ بھی اس دور کے اہم شاعر ہیں۔ ہندستان کی آزادی اور تقسیم کے بعد ملک کی جو سماجی، سیاسی اور معاشرتی صورتحال رہی اس سے اردو شاعری بھی متاثر ہوئی۔ آزادی کے بعد ترقی پسندی کا زور ٹوٹنے لگا اور ایک نئے رجحان نے اردو شاعری میں جنم لیا جسے ہم جدیدیت کے نام سے جانتے ہیں۔ یہ ۱۹۶۰ء کا زمانہ ہے۔ اس کے بعد یعنی ۱۹۸۰ کے آس پاس اردو شعر و ادب میں ایک اور رجحان نے جنم لیا جسے مابعد جدیدیت کہا جاتا ہے۔

آزادی کے بعد ملک کے جو حالات تھے وہ ناگفتہ بہ تھے۔ فرقہ وارانہ فسادات نے انسانیت کو پامال کر دیا تھا۔ لاکھوں انسانوں کے قتل اور عصمتوں کے لٹ جانے کے بعد انسانی خود کو خلا میں محسوس کر رہا تھا۔ اس کا کوئی مداوا بھی نظر نہیں آتا تھا جس کی وجہ سے انسان مایوسی کا شکار ہو گیا۔ اس صورت حال نے جدیدیت کو جنم دیا۔ حالانکہ جدیدیت مغرب کی دین ہے لیکن اس کی لہر اردو میں مغرب کے مقابلے بہت دیر میں آئی۔ اردو میں جدیدیت کی آمد کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ اس عہد کا انسان ناامیدی اور مایوسی کی دبیز چادر میں لپٹا ہوا تھا۔ احساس تنہائی شدید تھا۔ اور انسان اپنی ذات میں گم ہوتا جا رہا تھا۔ اس عہد کے شعرا نے محسوس کیا کہ ہمارے زمانے کے حالات ہیں وہ وہی پیش کریں گے۔ زندگی اتنی گنجلک ہو چکی ہے لہٰذا اس کا اظہار بھی اسی نوعیت سے ہونا چاہئے۔ حالانکہ جدیدیت کی بعض باتوں سے ادب کو نقصان بھی پہنچا لیکن جدیدیت نے صحت مند ادب بھی دیا جو اپنے عہد کے حالات کی پیش کش کے ساتھ ایک عمدہ سرمایہ ہے۔ اس عہد کے جن شعرا نے اپنی الگ شناخت بنائی ان میں اولیت کے ساتھ حسن نعیم، منیر نیازی، شہریار، مخمور سعیدی، افتخار عارف، ظفر اقبال، عرفان صدیقی، شکیب جلالی، کمار پاشی، سلطان اختر وغیرہ کا نام شامل ہے۔ جدید شعرا اپنے اسلوب اور موضوع کے اعتبار سے تازہ کار ہیں۔ اس کی مثالیں دیکھی جا سکتی ہیں:

یہ کیا کہ ایک طور سے گزرے تمام عمر
جی چاہتا ہے اب کوئی تیرے سوا بھی ہو
ناصر کاظمی

پہلے تھا جو بھی آج مگر کاروبار عشق
دنیا کے کاروبار سے ملتا ہوا سا ہے
شہریار

سرائے دل میں جگہ دے تو کاٹ لوں اک رات

نہیں یہ شرط کہ مجھ کو شریک خواب بنا
حسن نعیم

اب ملے ہم تو کئی لوگ بچھڑ جائیں گے
انتظار اور کرو اگلے جنم تک میرا
بشیر بدر

کچھ تو مرے پندار محبت کا بھرم رکھ
تو بھی تو کبھی مجھ کو منانے کے لیے آ
احمد فراز

بھلا ہوا کہ کوئی اور مل گیا تم سا
وگرنہ ہم بھی کسی دن تمہیں بھلا دیتے
خلیل الرحمن اعظمی

فروغ جسم نہ رنگینی قبا دیکھیں
یہ دیکھ پائیں تو ان سب سے ماورا دیکھیں
ظفر اقبال

ناصر ہزار ربط محبت کے باوجود
وہ ماورا رہا مرے وہم و گمان سے
ناصر شہزاد

زیست اب کس طرح بسر ہوگی
دل نہیں لگ رہا محبت میں
جون ایلیا

یہ اور بات کہ وہ لب تھے پھول سے نازک
کوئی نہ سہہ سکے لہجہ کرخت ایسا تھا
شکیب جلالی

ہر ایک لمحہ مجھے ٹوٹنا بکھرنا تھا
وہ مہرباں بھی کہاں تک سمیٹتا مجھ کو
سلطان اختر

آبلہ پا ہو ں آپ اپنے ہی نقش قدم سے ڈرتا ہوں
تنہا تنہا پھرتے پھرتے اپنا سایہ بھول گیا
شاذ تمکنت

ہوں اپنے خیالات پریشاں سے گریزاں
تنہائی کے لمحات سے گھبرانے لگا ہوں
مخمور سعیدی

وہاں کی روشنیوں نے بھی ظلم ڈھائے بہت
میں اس گلی میں اکیلا تھا اور سائے بہت
شکیب جلالی

ان آندھیوں میں بھلا کون ادھر سے گزرے گا
دریچے کھولنا کیسا، دیے جلانا کیا
عرفان صدیقی

روشنی جن سے ابلتی تھی وہ چہرے کیا ہوئے
سامنے کب سے وہی ننگی اندھیری رات ہے
شمیم حنفی

دیکھئے کیا کیا ستم موسم کی من مانی کے ہیں
کیسے کیسے خشک خطے منتظر پانی کے ہیں
بانی

یہاں نسائی لہجے کی شاعرہ پروین شاکر کا بھی ذکر کیا جانا ضروری ہے جس نے اردو شاعری کو اپنی کم عمری کے باوجود قابل ذکر سرمایہ عطا کیا اور غزل کو ایک نئی آب وتاب دی جس میں نسائی حسیت کے ساتھ خود سپردگی اور وارفتگی بھی ہے۔ پروین کے اشعار دل کو چھوتے ہیں

میں سچ کہوں گی مگر پھر بھی ہار جاؤں گی
وہ جھوٹ بولے گا اور لاجواب کردے گا

جدید رنگ کا ان کا یہ شعر بھی دیکھا جاسکتا ہے۔

رنگ وہ پھیلے کہ نیندوں سے چرائے نہ گئے
بارشیں رقص میں تھیں اور زمیں ساکت تھی
پروین شاکر

بہرکیف جدید شعرا نے نئے انداز اور نئے مضامین کے ساتھ اپنی روایت کی پاسداری بھی کی ہے۔ درج بالا اشعار میں اس بات کو بھی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ شمیم حنفی نے لکھا ہے:

''غزل میں عشق کا تصور نہ اساسی مرکزیت کا حامل ہے اور نہ ترقی پسند شاعری کی طرح کسی بیرونی تصور کی صورت گری کا ذریعہ۔ اس کی حیثیت نئی غزل میں زندگی کے عام لیکن توانا اور مستحکم جذبے کی ہے جو تمام مسائل کے ہجوم میں خود کو متحرک رکھتا ہے اور اس کی تصویریں عشق کے مثالی یا سماجی تصور کی روایت سے نہیں ابھرتیں بلکہ روزمرہ زندگی کے ایک جیتے جاگتے خون کی حرارت سے معمور تجربے کی بنیاد پر مرتب ہوتی ہے۔'' (غزل کا نیا منظرنامہ۔ شمیم حنفی)

جدید غزل میں عشق اپنے بدلے ہوئے انداز میں جلوہ گر نظر آتا ہے۔ یہاں ہمیں عشق کا ایک نیا رنگ ہی نظر نہیں آتا بلکہ اس میں زندگی کے مسائل بھی در آئے ہیں جو غزل کی وسعت زمین کا پتہ بھی دیتے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ عشق کی یہ کیفیت روایتی غزل سے مختلف ہے۔ جدید غزل اسی سے عبارت ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ صورت حال کیوں پیدا ہوئی؟ پچھلے صفحات میں جو بات کہی گئی میں یہاں اسے دوہرانا چاہوں گا کہ یہ صورت 'وقت' نے پیدا کی ہے جس کی رفتار نے زندگی کے دھارے کو ایک نیا موڑ دے دیا ہے۔ اب انسان کے پاس فرصت نہیں کہ وہ کسی سے عشق کرے کیوں کہ زمانہ بدل چکا ہے زندگی بدل چکی ہے اور اس کے تقاضے بدل چکے ہیں۔ آج کی زندگی سائنس اور ٹکنالوجی کے دور سے عبارت ہے۔ آج دنیا سائنسی ترقی کے سبب ایک گاؤں میں سمٹتی جارہی ہے۔ لیکن اس میں ایک صورت خرابی کی بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ اس میں بھاگ دوڑ افراتفری کی سی ہے۔ ہر آدمی خود میں مگن اپنے مقصد کو لیے دوڑ رہا ہے کسی کو کسی کے بارے میں سوچنے کی فرصت نہیں اور نہ دیکھنے کی مہلت ہے۔ ایسے میں بھیڑ میں ہوتے ہوئے بھی انسان خود کو تنہا محسوس کررہا ہے۔ گویا سائنس اور ٹکنالوجی نے انسانی زندگی کو اور انسانی تہذیب کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ ایسے میں خاندانی نظام بھی بکھر کر رہ گیا ہے۔ سماجی زندگی اور تہذیب کا تصور مٹ چکا ہے۔ اور اس کی جگہ انفرادی زندگی کا تصور ابھر چکا ہے۔ یہ انفرادی سوچ انسان کو مفاد پرستی کی طرف لے گئی ہے۔ اور مفاد پرستی کے حصار میں گھرا ہوا انسان ہر لمحہ خود کو تنہا محسوس کررہا ہے۔ یہی اس دور کا المیہ ہے اور اسی المیے کی ترجمانی ہمارے جدید شعرا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ معروف شاعر اور ناقد پروفیسر لطف الرحمن نے اسی بات کو محسوس کرتے ہوئے کہا تھا:

''تنہائی کا احساس کچھ مخصوص حالات یا خود فرد کے ذاتی اعمال کا نتیجہ بھی ہوتا ہے۔ سماجی، اخلاقی ضابطوں کے انحراف سے بھی تنہائی پیدا ہوتی ہے.....انسانی اور اخلاقی قدروں کے زوال وانتشار کا تجربہ اور حق وصداقت کے لیے غیر مروج راہوں کا انتخاب ایسے لوگوں میں تنہائی کا احساس پیدا کرتا ہے۔ سماجی ومعاشرتی دباؤ اور اپنے اپنے مقاصد کی تکمیل اور مسائل ومعاملات کی فکر بھی تنہائی کی موجب ہے۔'' (جدیدیت کی جمالیات۔ لطف الرحمن)

جدید اردو شاعری کی روایت کا جائزہ لیتے ہوئے بہت سے شعرا کو نقل کرنے سے ہم قاصر رہے۔ جدید شعرا کی ایک لمبی فہرست ہے۔ ان میں کچھ کمتر اور کچھ برتر بھی ہیں۔ ہر ممکن کوشش کے باوجود کئی نام غیر دانستہ طور پر بھی رہ گئے ہیں لیکن یہاں ہمیں چند اور نام یاد آرہے ہیں جنہوں نے جدید غزل کی آبیاری میں اپنا خون جگر جلایا ہے۔ ان شعرا میں لطف الرحمن، شاہد کلیم، وہاب دانش، ظہیر صدیقی اور عین تابش کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے۔ یہ شعرا جدید شاعری کی روایت کو آگے بڑھانے میں پیچھے نہیں رہے بلکہ بھرپور تعاون دیا ہے۔ ان شعرا کے یہاں جدید شاعری کے تمام تر نکات ابھر کر سامنے آئے ہیں البتہ علامت اور ابہام سے قدرے گریز پایا جاتا ہے۔ مگر یہ ہمہ دم سرگرم رہے ہیں۔ رمزیت، ایمائیت اور علامت کا فراخدلانہ استعمال ان شعرا کے یہاں دیکھا جاسکتا ہے لیکن ان میں ژولیدگی نہیں۔ ان کے یہاں ذات کا کرب، یاس ومحرومی، تنہائی پسندی اور عصری آگہی جیسے موضوعات بھی دیکھے جاسکتے ہیں، لیکن یہ کام انہوں نے آزادانہ طور پر کیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہو:

ایک اک چہرے پہ لکھا ہے شکستوں کا حساب
اس گھنی بھیڑ میں اک ایک نظر ہے تنہا
لطف الرحمن

وہ حادثہ جسے چاہا کہ بھول جاؤں میں
مرے گمان و یقین سے بعید نہ ہو گا
ظہیر صدیقی

یہ دھواں سا اپنے چاروں اور ہے کیوں رات دن
جسم کے اندر کہیں ہم درد سے جلتے تو نہیں
وہاب دانش

ہر لمحہ ٹوٹتا ہوا اک اضطراب تھا
اپنا وجود اپنے لیے اک عذاب تھا
عین تابش

سورج چمک رہا ہے سوا نیزے پر یہاں
اس دشت کربلا سے کہیں بھاگ جایئے
سید احمد شمیم

روز وشب بے کیف تھے 'شام تھی سوئی ہوئی
شہر کی آنکھوں میں تھی بے منظری بوئی ہوئی
شاہد کلیم

دیار حسن میں اب روشنی کہاں باقی
بس اک غبار سا ہر سمت اڑ رہا ہوگا
شہزاد احمد

دلوں کی اور دھواں سا دکھائی دیتا ہے
یہ شہر تو مجھے جلتا دکھائی دیتا ہے
احمد مشتاق

ہوئے طاق روشن مگر خوف ہے

پتنگے چراغوں میں جل جائیں گے
پرکاش فکری

دریا ہو یا پہاڑ ہو ٹکرانا چاہئے
جب تک نہ سانس ٹوٹے جئے جانا چاہئے
ندا فاضلی

تم اپنے زخموں میں آگ بھر کر ٹھٹھرتی راتیں قبول کرلو
سفر کی منزل قریب ہے اب تھکن کو اپنے امان مت دو
صدیق مجیبی

حیات پیاس کا صحرا بنے تو پھر اس میں
کچھ آرزو کے چمکتے سراب بھی رکھ دو
جامی

ان شعرا کے علاوہ جدید شاعروں میں علیم اللہ حالی، شمیم فاروقی، ظہیر غازی پوری، صبا اکرام، شاہد احمد شعیب، ثوبان فاروقی، شام رضوی، قیصر صدیقی، شمیم قاسمی اور خورشید طلب کسی طور پر بھی فراموش کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ شاہد کلیم نے بہار کے جدید شعرا کے تعلق سے اپنی رائے کا اظہار ان لفظوں میں کیا ہے:

'' .....لطف الرحمن کے یہاں حیات و کائنات کے مابین ہم آہنگی اور ربط و معنی کی تلاش کا سلسلہ نہ صرف ان کی ذات تک ہی پہنچ کر ختم ہو جاتا ہے اور نہ ان کی ذات کے درون خانہ سے گزر کر کائنات کی روح میں سمٹ جاتا ہے بلکہ وہ لامحدود آسمان کی طرف مڑ جاتا ہے۔ اس طرح ان کے پیش نظر صرف ذات اور ذات کی کربنا کی کا بھی منظر نامہ نہیں بلکہ ایک وسیع و عریض ارضی و سماوی کینوس ہے جس پر روزمرہ کے مشاہدات و تجربات کے ذریعے مختلف زاویوں سے حیات و کائنات کی رنگ برنگی تصویریں بنانے میں وہ مصروف ہیں۔

سلطان اختر کی شاعری مایوسی اور ناکامی کا مکمل منظر نامہ نہیں۔ دراصل ان کی شاعری رجائیت اور امکانات سے معمور ہے اور یہی رجائی پہلو ان کی شاعری کا وہ بنیادی وصف ہے جو انھیں جدید شعراء کے درمیان ایک امتیازی مقام تفویض کرتا ہے۔ صدیق مجیبی کی غزلیں نہ تو جدید ہیں اور نہ ترقی پسند بلکہ دونوں کے انضمام سے ایک تیسری چیز عالم وجود میں آتی ہے۔ اس طرح ان کی آواز نہ تو ناصر کاظمی اور شہریار کی طرح دھیمی ہے اور نہ ہی ترقی پسند شعراء کی طرح تیز۔ پرکاش فکری کے یہاں ایک طرف جہاں موضوعات میں تنوع ہے وہیں پیکر کا بھی انتظام و انصرام ہے حقیقتاً ان کی شاعری کسی ایک نقطہ پر مرتکز نہیں بلکہ مختلف موضوعات پر روشنی ڈالتی ہے۔ مظاہر فطرت کے خدوخال سے تحصیل مسرت کا رجحان علیم اللہ حالی کے یہاں بڑا واضح ہے۔ اس طرح مظاہر فطرت سے ان کی یہ دلچسپی صرف ان کے احساس جمال کی ہی غماز نہیں بلکہ ان کے شعور ذات اور شعور کائنات کا بھی ادراک بخشتی ہے۔'' (بحوالہ بہار میں جدید غزل۔ ڈاکٹر عطاء اللہ خاں۔ ص ۱۲)

بہرحال اردو غزل کا ہنوز ارتقا جاری ہے۔ ہم فی الوقت اس دور میں ہیں جہاں مابعد جدیدیت کا زور بھی ٹوٹ چکا ہے اور آزادانہ طور پر زلف غزل کی مشاطگی ہو رہی ہے۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ چند غیر صحت مند رجحانات کے سبب وقتی طور پر غزل کی روح متاثر بھی ہوئی۔ جیسے اینٹی غزل یا جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے بعض منفی رویوں نے فن غزل کو مجروح کیا لیکن غزل اس خندق کو عبور کر کے آگے کی جانب بڑھ چکی ہے اور امید ہے کہ آئندہ دنوں میں اردو شاعری کی یہ صنف مزید توانا ہوگی۔

ڈاکٹر توقیر عالم توقیر
اسسٹنٹ پروفیسر
شعبۂ اردو، مولانا مظہر الحق عربی و فارسی یونیورسٹی، پٹنہ